ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

بے خدا سائنس کے خلاف علّامہ اقبال کی جنگ

زمانۂ جدید کے سائنسی علم کی بے خدائیت کے خلاف جس عظیم مفکّر نے عہد حاضر میں سب سے پہلے اپنی آواز بلند کی وہ علامہ اقبالؒ ہی تھے۔ اُن کے دردناک اور پُرسوز اشعار میں یہ شعر بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے :۔

عشق کی تیغِ جگر دار اڑائی کس نے ؟ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

یعنی اے ساقی وہ کون ہے جس نے عشقِ الٰہی کی خاراشگاف تلوار کو جُدا لیا ہے (کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ، سائنسی علم کے ہاتھ میں خالی نیام ہی رہ گئی ہے (اور وہ تیغِ جگردار غائب ہے) یہ کس نے اڑائی ہے ؟

بعدازاں کئی دیگر مفکّرین نے بھی اس بات کو دوہرایا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر پی۔ سارو کن بھی جو کہ ہارورڈ یونیورسٹی میں محکمۂ عمرانیات کے چیئرمین رہ چکے ہیں اور جو مجلّہ کرسچین مانیٹر کے بقول ہمارے زمانے کے عظیم ترین حکمائے عمرانیات میں سے ایک ہیں، اپنی کتاب موسوم بہ "ہمارے زمانے کا بحران" میں رقم طراز ہیں :۔

"مذہب اور سائنس کے درمیان عہد حاضر میں زبردست تضاد و اختلاف دراصل غیر حقیقی اور غیر ضروری ہے چہ جائیکہ یہ تباہ کن بھی ہو۔ کسی موزوں نظریۂ حقیقتِ صادقہ اور قدر صحیحہ کی روشنی میں مذہب اور سائنس دونوں ایک ہی ہیں اور دونوں ایک ہی مقصد کی تکمیل کر رہے ہیں اور وہ مقصد یہ ہے کہ حقیقتِ مطلق کو یوں بے نقاب کیا جائے کہ اس کی

بدولت عظیم تر شرفِ انسانی ظہور میں آتا چلا جائے اور جلالِ خداوندی بھی تابندہ تر اور قوی تر ہوتا چلا جائے۔"

پروفیسر سارو کن کے یہ الفاظ علامہ اقبالؒ کے ان دو اشعار کا قریب قریب ترجمہ ہی معلوم ہوتے ہیں:۔

وہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام — وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسماء
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں — مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

یہ توصیف اس شخص کی تلاشِ حق کی دو منزلیں ہیں جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ قادرِ مطلق خدا نے اس کو جملہ اسماء کا علم عطا کر دیا تھا۔ سائنس کی منزل کا تعلق زمان و مکان کی سیاحت و پیمائش کے ساتھ ہے اور عبادت کی منزل کا تعلق اس عرفان و اعترافِ حقیقت کے ساتھ ہے کہ سبحان ربی الاعلیٰ پاک و برتر ہے میرا ہی رب عالی!

اقبالؒ نے اپنی تالیف "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" (ششم خطبات) میں فرمایا ہے کہ:۔

"ایک سائنس دان کا عمل جو فطرت کے مشاہدہ و مطالعہ میں مصروف منہمک ہے، ایک عابد کے عمل سے مختلف نہیں ہے، کیونکہ دونوں ایک ہی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔"

اقبالؒ کا وہ شعر جو اس مقالہ کے پہلے فقرہ کے آغاز میں نقل کیا گیا ہے اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک عشقِ الٰہی کی تلوار کا اصلی اور موزوں ترین مقام سائنسی علم کی نیام کے اندر ہی تھا۔ مگر اس کو بعد میں سرقہ کر لیا گیا ہے۔ یہاں اقبالؒ اس امر واقعہ کا حوالہ دے رہے ہیں جو کہ زمانۂ مابعد سے لے کر اب تک بالکل اظہر من الشمس ہو چکا ہے اور جس کے لئے ہم جناب سارٹن اور برفالٹ کی ان تحریروں کے ممنونِ احسان ہیں کہ "سب سے پہلے مسلمانانِ ہسپانیہ نے ہی سائنس کا طریقہ ایجاد کیا تھا اور انہوں نے ہی جدید سائنس کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔" اس سلسلے میں برفالٹ لکھتا ہے:۔

"ہماری سائنس پر عربوں کی سائنس کا صرف یہ بار احسان ہی نہیں کہ انقلابی نظریات کی خیرہ کن ایجادات و اختراعات ظہور میں ہوئیں بلکہ ہماری سائنس تو تمدن عرب کے اس سے بھی زیادہ گراں قدر احسانات کی ممنون ہے۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنی زندگی بھی تمدن عرب سے ہی

حاصل کی تھی۔ زمانۂ قدیم جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ دراصل زمانۂ ماقبل سائنس تھا، یونانی فلکیات اور ریاضیات بھی دراصل غیر ملکی درآمدات تھیں، جن پر اہلِ یونان نے کبھی اپنے پورے تملک اور تسلط کا استحقاق نہیں جتایا تھا۔ دنیا کے ان اوّلیں اور بنیادی سائنس دانوں کی سائنس کا سنگِ بنیاد دراصل خدا کا یہ تصوّر تھا کہ وہ خالقِ حقیقی ہے جس کی ہستی اور جس کی صفاتِ خود نظارہ فطرت اور مشاہدۂ فطرت کے اندر ہی جلوہ گر ہے۔ درحقیقت عربوں کا یہ تصوّرِ خدا ہی تھا، جس نے سائنس کو دائرۂ امکان میں داخل کیا تھا۔" جیسا کہ ہمایوں کبیر معروف ہندی فلاسفر نے جو کہ ماضی قریب تک ہندوستانی کابینہ کے ممبر تھے۔ اپنی کتاب موسوم بہ "سائنس، جمہوریت اور اسلام" میں لکھا ہے :-

"ایک خدا کا مطلب، ایک کائنات، لہٰذا ایک ہی قانون تھا۔ توحیدِ خداوندی کا عقیدہ ہی سائنس کے ظہور کی شرطِ اوّل تھا۔ وحدتِ خداوندی پر اسلام کا زور اس کے سائنٹیفک نقطۂ نظر کی بنیاد تھا۔"

جب مسلمانوں کو ہسپانیہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تو سائنس ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جن کو اہلِ یورپ متبعین پال کہتے تھے اور جن کو عام طور پر ماڈرن عیسائی بھی کہا جاتا ہے۔ مسلم سائنس دانوں کے عیسائی مقلّدین کا مقدّر شائد یہی تھا۔ کہ وہ انسانیت کی بدترین مخالفت اور بدخدمتی کا ارتکاب کریں، جس کی مثال دنیا بھر میں کسی دوسرے انسانی گروہ میں نا پید ہو، حالانکہ مذکورہ گروہ کو علم میں دلچسپی رکھنے کا دعویٰ بھی تھا۔ عقیدہ عیسائیت کی روایات کے زیرِ اثر جو انسانی زندگی کو دو الگ الگ قیاسی حصّوں میں منقسم کرتی ہیں، یعنی مذہبی اور دنیاوی روحانی اور مادی، مقدس اور پلید حصص۔ یوں ان لوگوں نے خدا کے تصوّر کو سائنس سے الگ تھلگ کر ڈالا کیونکہ سائنس کو انہوں نے اپنے ذہنی مطالعے کی بنا پر سراسر دنیاوی چیز قرار دے دیا تھا۔ جس کا تعلق مادی دُنیا کے مطالعہ و مشاہدہ کے ساتھ تھا۔ دراصل یہ ایک غیر معقول کوشش تھی۔ جس نے زندگی کی کلیت میں تفرقہ اندازی کا بیج بویا۔ جس کے باعث حقیقتِ واحدہ کو دو ایسے متضاد حصّوں میں منقسم کر دیا گیا۔ جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو۔ تاہم سائنس کی "بے خدائیت" کا عقیدہ جو کہ

عیسائیت کی مقتضیات سے بطریق بالا پیدا ہوا تھا دنیائے عیسائیت میں قائم رہنے کے لئے معرضِ وجود میں آگیا۔ اِس تفریق کو مزید تقویت وحمایت چرچ اور سٹیٹ کی علیحدگی سے ملی جبکہ یہ علیحدگی ان دونوں کی اُس تلخ اور طویل مناقشت کے نتیجے میں روبہ عمل آگئی جس کے دوران چرچ نے نہایت ہی بے رحمی اور سنگدلی کے ساتھ کئی سائنس دانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اندریں حالات صرف اِسی قسم کے نظریاتِ سائنس کو ہی فروغ مل سکتا تھا جو کہ چرچ کے عین مطابق ہوں اور جن کو چرچ کی حمایت میں ایک قسم کی شہادت ثابت کرنا آسان متصور ہو سکتا تھا۔ اس قسم کے نظریات میں انیسویں صدی کے مادی اور میکانکی نظریے شامل تھے اور ڈارون کا نظریۂ ارتقاء بھی اس زمرہ میں داخل تھا۔ جس کی رُو سے فطرت میں کسی تخلیقی اور ہادیانہ قوت کی ضرورت ہی باقی نہ رہ جاتی تھی۔ نتیجتہً وجود خداوندی کی ضرورت بھی مفقود تھی۔ لہٰذا دنیا بہت جلد اس بات کو بھول گئی کہ سائنس میں نظریۂ بے خدائیت کو عیسائیت نے ہی جنم دیا تھا اور بعد ازاں دنیا یہ خیال کرنے لگ گئی کہ اصل میں بے خدائیت کا تقاضا خود سائنس نے ہی کیا تھا۔ عیسائی اہلِ مغرب اپنے سائنسی علم کو بڑی شدت و احتیاط کے ساتھ اُن راستوں سے بچا بچا کر رکھتے تھے، جو تصورِ خدا کی طرف جاتے تھے۔ اور وہ سائنس کو ہر قیمت پر اُن حدود کے اندر مقید رکھتے تھے، جو انہوں نے سائنس کے بارے میں اپنے عقیدہ بے خدائیت کی رو سے مقرر کر رکھی تھیں۔ نتیجتاً وہ اُس ذہنی اور تخلیقی سرگرمی کی شہادت کو نظر انداز کر دیتے تھے جو مظاہرِ فطرت میں فی الواقع توازن، نظم وضبط، نظام، منصوبہ بندی، قصد، ارادہ، اختیار، ریاضیاتی فکر، ارتقائی تحریک وجذبہ، خود بخود نشو ونما، اعلیٰ سے اعلیٰ تر، تکمیل وپیچیدگی کے مراحل کی صورت میں ہمارے مشاہدے میں ہوتی رہتی ہے یا پھر جس شہادت کو ہم کلیت، وحدت، یکسانیت، مقصدیت، ارادیت، تنظیم وترتیب، تطابق اشتراک وتعامل، انتخاب واختیار وغیرہ کی شکل وصورت میں مسلسل وپیہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ سائنس دان اپنے عقیدۂ بے خدائیت کی بنا پر اِن تمام صورتوں کی تشریح وتوضیح نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ جب یہ شہادت چاروں طرف سے اُن کو گھیر لیتی تو پھر بھی وہ اس کی تشریح کے لئے اس قسم کے مابعد الطبیعیاتی نظریے ایجاد کرتے ہیں جیسا کہ سر جیمز جینز کا نظریۂ ریاضیاتی ذہن

یا برگساں کا ولولۂ حیات یا ڈریش کی آرزوئے تکمیل وغیرہ وغیرہ ،

یہ لوگ تصورِ خدا سے کبھی استفادہ نہیں کرتے ۔ لیکن اس قسم کی تشریحات بمشکل ہی مناسب و کافی یا تسلی بخش ثابت ہوتی ہیں ۔ کیونکہ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ " ریاضیاتی تفکر " ۔ " طبیعاتی مظاہر کی " صناعی " جاندار خلیے کی تیاری اور زندگی کی دوڑ جو اعلیٰ سے اعلیٰ تر مراحل تکمیل و پیچیدگی کی طرف جاری و ساری ہے اور جو ان تصورات و نظریات میں بالترتیب مضمر ہے اس کی صفات و خصوصیات صرف اسی کامل و مکمل شخصیت سے پائی جا سکتی ہیں ۔ جس میں شخصیت کے جملہ عناصر و اجزائے خصوصی اور صفات موجود ہوں ۔ یعنی عقلی ، اخلاقی ، جمالیاتی ، تخلیقی اور جذباتی خواص جن سے ہم بخوبی آگاہ ہیں ۔ ایسی کامل و مکمل شخصیت خدا کے بغیر کسی اور کی نہیں ہو سکتی ۔

اگرچہ بے خدا سائنس یہ نہیں کہتی کہ " کوئی خدا موجود نہیں ہے ۔ " پھر بھی یہ اس واحد ماخذ کے آگے ایک دیوار کھینچ کر کھڑی کر دیتی ہے ۔ جس سے علم کی روشنی اور عشقِ الٰہی کی روشنی انسان کو ملتی ہے ۔ یعنی فطرت کا مشاہدہ و مطالعہ کرنے کا شعور اور فطرت سے سروکار رکھنے کی سکت پیدا ہوتی ہے ؛ کیا یہ بات عقیدۂ بے خدائیت کے ساتھ ممکن ہے ۔

اقبال نے فرمایا ہے کہ :-

ع — علم حق اوّل حواس آخر حضور

خدا کا عرفان سب سے پہلے حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور پھر کہیں جا کر بعد میں مراقبہ و غور و فکر کے ذریعے ظہور پذیر ہوتا ہے ۔

اِس طرح بے خدا سائنس پہلے اپنے شکار کو یوں سوچنے اور عمل کرنے پہ مجبور کرتی ہے کہ گویا خدا موجود نہیں ہے ۔ یہ تو صاف انکارِ خدا سے بھی بدتر ہے ۔ کیونکہ صاف انکارِ خدا میں تردید کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ (جس سے سائنس صاف بچ نکلتی ہے) یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس نے آدمؑ اور کائنات کے بے خدا فلسفوں کو جنم دیا ہے ۔ مثلاً ڈارونیت ، مارکسیت ، فرائڈزم (فرائڈیت) ایڈلرزم (ایڈلریت) ، تجربیت ، منطقی اثباتیت اور انسان دوستی کا عقیدہ وغیرہ وغیرہ ، اسی لئے تو سائنس نے انسانی طبیعت اور انسانی سرگرمیوں کے بے خدا فلسفے پیدا کئے ہیں ۔ بے خدا

اخلاقیات، بے خدا سیاسیات، بے خدا معاشیات، بے خدا قانونیات، بے خدا فلسفۂ تعلیم، بے خدا فلسفۂ تاریخ اور بے خدا نفسیات فرد و اجتماع۔ یہ سب فلسفے مجبوراً انسانی طبع کی اہم ترین حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ انسان کی جملہ عملی سرگرمی کی تحریک محض اپنے کسی نصب العین کے حصول کی خاطر پیدا ہوتی ہے جو کہ سب سے زیادہ کامل اور جمالیاتی نصب العین کے ذریعے ہی تسکین پا سکتی ہے اور یہ کامل جمال و کمال صرف خدا کی ذات میں ہی اور بہت ہو سکتا ہے، لہٰذا سائنس کی بے خدائیت کوئی معمولی سادہ اور بے ضرر کتابی تبدیلی ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو بدترین بڑی تبدیلی ہے۔ جس سے بنی نوع انسان کے رجحانات اور اطوار و میلانات متاثر ہوتے ہیں اور جن کے ساتھ ہی اُن کے اقدار، پیمانہ جات، نظریات، امیدیں اور ہمتیں، اغراض و مقاصد یکسر بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ بدترین تبدیلی بنی نوع انسان کے اعمال و تحریکات کو متاثر کرتی ہے۔ انسان کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے خیال و عقیدہ کے مطابق ہی عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ اگر اس کے خیالات ہی دہریانہ اور بے خدا ہوں گے تو پھر اس کے اعمال بھی غیر خدا اندیش اور کافرانہ ہی ہوں گے۔ لہٰذا سائنس کی بے خدائیت انسانی سرگرمیوں میں ایک عظیم تبدیلی ہے۔ جس کی وجہ سے فی الواقع تاریخ کا دھارا بدل گیا ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا میں کوئی عالمگیر اور یکساں یا روحانی قوت باقی نہیں رہ گئی جو انسانوں کو اندر سے کنٹرول کرے اور ہدایت کا بندوبست کر سکے۔

یہی ایک وجہ ہے جس کی روشنی میں ہم جدید دنیا کی انسانی سوسائٹی کی خصوصی بدقسمتیوں اور پریشان حالیوں کی تشریح کر سکتے ہیں۔ کبھی نہ ختم ہونے والی عالمگیر جنگیں جو سائنٹیفک مہلک ہتھیاروں کے ساتھ لڑی گئیں جن سے عوام موج در موج مارے گئے اور جب ایک جنگ تھمی تو سرد جنگ کا واقعہ در پیش آیا، جس میں زیادہ زور شور کے ساتھ اگلی جنگوں کی تیاری شروع کر دی گئی۔ بین الاقوامی اخلاق کی عدم موجودگی، سیاست دانوں کے جھوٹ اور دھوکے جو سیاسی اموات پر منتج ہوتے ہیں اور جن سے مختلف ممالک میں یکے بعد دیگرے شورشیں پیدا ہوتی ہیں۔ اطمینانِ قلب کا فقدان آج اقتصادی خوشحالی بھی موجود ہے۔ جس سے نفسیاتی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ جرائم کی رفتار تیز تر ہوتی ہے خودکشیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

آئے دن کی بڑھتی ہوئی قبل از بلوغت جنسی بے راہ روی اور شادی شدہ جوڑوں کی بے وفائی بداخلاقی اور بدتمیزی جو ہر روز ہولناک رفتار اور خوفناک تناسب سے مزید بڑھتی اور پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ علم کے تقدس کا احساس اور استاد کا ادب ناپید ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں امن و امان اور نظم و ضبط برباد ہو رہا ہے۔ بے خدا سائنس نے ہر جدید کالج کو ایسے انسانوں کی تربیت گاہ (نرسری) بنا دیا ہے جو خدا اور اخلاق دونوں پر ہنستے ہیں اور ان دونوں کا برابر کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ تو ہر اچھائی، جمال، حق، نیکی اور خوبی کو قتل کرنے کے برابر ہے اکبر الہ آبادی مرحوم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

؎ یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

(فرعون بچوں کے قتل کے الزام سے صاف بچ نکلتا، مگر افسوس ہے کہ اُسے کالجوں کے ادارے کھولنے کی تجویز نہ سوجھ سکی۔)

ایسے ہی حقائق و واقعات کی بنا پر علامہ اقبالؒ نے سائنس کی بے خدائیت کے خلاف اپنی آواز بلند کی تھی۔

؎ علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں

(بے خدا سائنس کو شیطان کے شاگردوں نے پیدا کیا ہے، مگر جو علم خدا کے تصور پر قائم ہو وہ پاک فرشتوں کی تخلیق ہوتا ہے۔)

؎ علم کو از عشق برخوردار نیست
جز تماشا خانۂ گفتار نیست

بے خدا سائنس لفظوں کی تماشا گری (شعبدہ بازی) کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بے ربط نہ ہوگا کہ علامہ اقبالؒ نے خود اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے علم کو عموماً اس علم کے معنوں میں استعمال کیا ہے جو حواس کی مدد سے حاصل کیا گیا ہے اور یہی سائنس

ہے۔ اقبال نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں لکھا ہے۔

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جو حواس پر مبنی ہے۔ مَیں نے عموماً علم کو اِسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس قسم کے علم سے ہمیں فطرت کی قوتوں پر قدرت و قبضہ حاصل ہوجاتا ہے۔ اور ہمارے اس قبضہ و قدرت کو مذہب کے تابع فرمان رہنا چاہیئے، ورنہ یہ شیطنیت ہوگی۔"

اقبال کے بقول اگر سائنس تصورِ خدا پر مبنی ہو تو یہ اپنی ترقی و فروغ کی منزلوں میں اپنے آپ کی اصلاح کر لینے کے قابل بھی ہوجائے گی۔ مگر بے خدا سائنس میں یہ صفت و قوت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اس ہدایت کی روشنی سے محروم ہوجاتی ہے جو تصورِ خدا سے پیدا ہوتی ہے۔

؎ وہ علم اپنے بُتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
وہ علم بے بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلّیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

وہ سائنس کا علم جو عشقِ الٰہی کے ساتھ ہو، وہ بالعمل اپنے بتوں کا آپ ابراہیم بن جاتا ہے (اور اپنے نتائج کی اصلاح کر سکتا ہے) لیکن وہ دوسرا علم محض اندھا پن ہے۔ جس میں سائنسدانوں کے مشاہدات کے ساتھ تجلّیِ موسیٰؑ کا ظہور نہ ہو،

علامہ اقبالؒ نے تصورِ خدا کو سائنس کے ساتھ متحد و واصل کرنے کی ضرورت پر بڑا زور دیا ہے۔ اور ایک مکالمہ بصورتِ نظم لکھا ہے جو زیرکی اور عشق کے درمیان یعنی سائنس اور حُبِّ الٰہی کے درمیان مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ فرمایئے:۔

نگاہم راز دار ہفت و چار است
گرفتارِ کمندم روزگار است
جہاں بینم بایں سُو باز کردند
مرا با آنسوئے گردوں چہ کار است

چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم
بہ بازار افگنم رازے کہ دارم

۱۔ میں سات آسمانوں اور چار عناصر کے رازوں سے آگاہ ہوں (یعنی زمین و آسمان کے رازوں کا علم رکھتا ہوں) تمام زمانوں کے واقعات اور ہنگامے میری گرفت میں ہیں۔

۲۔ میری نظر اور بصیرت اس مادی دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے تھی۔ مجھے اس دنیا سے کیا سروکار جو کہیں آسمانوں کے اُس پار ہے۔

۳۔ اُس ساز اور باجے میں جو میرے قبضے میں ہے، ہر طرح کے راگ اور نغمے پوشیدہ ہیں، میں اُن رازوں کو عام لوگوں کے سامنے برسرِ بازار بیان کر دیتا ہوں، جو میرے علم میں آ جاتے ہیں۔

عشق کا جواب ملاحظہ فرمایئے :۔

۵۔	نہ افسونِ تو دریا شعلہ زار است	ہوا آتش گزار و زہر دار است
چو با من یار بودی نور بودی	بُریدی از من و نور تو نار است
نجلوت خانۂ لاہوت زادی	ولیکن در نخ شیطان فتادی
بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز	تہِ گردوں بہشت جاوداں ساز
بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر	جہان پیر را دیگر جواں ساز
زِ روزِ آفرینش ہمدم استیم	ہماں یک نغمہ را زیر و بم استیم

مجھے اعتراف ہے کہ تیرے پاس جادو کی قوتیں ہیں۔ مگر تو نے مجھ سے دُور ہو کر دنیا کو دوزخ بنا ڈالا ہے، تو نے دریاؤں اور سمندروں میں آگ لگا دی ہے۔ (جنگی جہازوں سے بمباری کا حوالہ) اور فضاؤں میں بھی آگ اور زہر کو پھیلا دیا ہے (ہوائی جہازوں سے بمباری اور زہریلی گیس پھینکنے کی طرف اشارہ) جب تک تو میری طرف دوستانہ نگاہ رکھتا تھا۔ اُس وقت تک تُو ایک روشنی کی مثال تھا اور اب جبکہ تو مجھ سے کٹ چکا ہے، تو آگ بن گیا ہے۔ میری طرح تو بھی روحانی دنیا کے طبقات میں پیدا ہوا تھا۔ مگر اب تو شیطان کا شکار بن چکا ہے۔ آ کہ ہم دونوں مل کر اس دنیا کو بہشت بنا دیں۔ میرے

درد ِ دل کا ایک ذرّہ لے لے اور اس قدیم بوڑھی ہوتی ہوئی دنیا کو پھر سے جواں سال بنا دے۔ کیونکہ ہم دونوں روزِ ازل سے دوست چلے آتے ہیں۔ اور ہم دونوں ایک ہی نغمہ کے زیر و بم ہیں۔ علامہ اقبالؒ یہیں نہیں رک جاتے۔ چونکہ انہیں یقینِ واثق ہے۔ کہ زیرکی یعنی سائنس کے ساتھ تصوّرِ خدا کے اتحاد اور وصل سے ایک جدید عالمگیر ذہنی و عقلی انقلاب برپا ہوگا۔ لہٰذا وہ مسلمانوں کو اس بات اُبھارتا ہے کہ وہ سائنس کے ساتھ تصوّرِ خدا کا اتحاد پیدا کرکے دنیا میں اس انقلاب کو برپا کردیں۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات   شرقیاں را عشق رمزِ کائنات

زیرکی از عشق گردد حق شناس   کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر بود   نقشبندِ عالمِ دیگر بود

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ   عشق را با زیرکی آمیز دہ

۱۔ مغربیوں کے لئے سائنس ہی حسن و جمالِ حیات ہے۔ شرقیوں کے لئے عشقِ الٰہی رازِ حیات ہے۔

۲۔ سائنس عشق کی بدولت اسرارِ حیات سے آگاہ ہوتی ہے، جبکہ عشقِ الٰہی کے کاروبار میں سائنس کے ذریعے مستحکم بنیاد میسّر آتی ہے۔

۳۔ جب عشقِ الٰہی سائنس کے ساتھ واصل و متحد ہو جاتا ہے تو زندگی کا نیا نظام معرضِ وجود میں آجاتا ہے۔

۴۔ اے مسلم! اُٹھ بیدار ہو، اور سائنس کو عشقِ الٰہی سے متحد کرکے ایک نیا نظامِ جہاں پیدا کرکے دکھا دے۔

اس امر کی ناقابلِ تشکیک اور قطعی شہادت موجود ہے کہ ہمارے نظریہ و نصب العین میں ایسی ایسی طاقتیں پوشیدہ ہیں کہ ہم اُن کی بدولت سائنس کو تصوّرِ خدا کے ساتھ متحد اور واصل کردینے کی اہلیت رکھتے ہیں اور یوں اُس جدید عالمی نظام کو برپا کرسکتے ہیں، جس کی پیش گوئی علامہ اقبالؒ نے کی ہے۔

تمت بالخیر

(ترجمہ چودھری نبی احمد) ——————